فَسْئَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ

"تو پوچھ لیا کرو ان سے جو جانتے ہیں، اگر تم نہیں جانتے" (ترجمہ شیخ الہندؒ)

فتاوی یسئلونک

دار الافتاء والارشاد

الباقیات الصالحات فاؤنڈیشن رجسٹرڈ

شمارہ 98 | جمعۃ المبارک 01 جمادی الثانی 1442ھ 15 جنوری 2021ء

سوال ارسال کرنے کے طریقے

- **بالمشافہ**: سوالات تحریری صورت میں متعین سوالنامے پر بالمشافہ جمع کروائیں۔
- **بذریعہ ویب سائٹ**: www.yasalunak.com پر موجود سوالنامے کے ذریعے ارسال کریں۔
- **بذریعہ برقی مراسلہ**: ask@yasalunak.com پر برقی مراسلے (ای میل) کی صورت میں ارسال کریں۔
- **بذریعہ واٹس ایپ**: 0333-9206874 پر مکمل نام کے ساتھ واٹس ایپ کریں۔

نوٹ: جوابات / فتاویٰ سوالات موصول ہونے کی ترتیب سے ارسال کیے جاتے ہیں۔

دار الافتاء والارشاد، الباقیات الصالحات فاؤنڈیشن رجسٹرڈ، فقہ اکیڈمی C-335 بلاک 1، گلستان جوہر، کراچی

ایسے شخص کو زکوۃ دینا جس کی ملکیت میں خالی گھر ہو

سوال: آپ کی کیا رائے ہے اس شخص کے بارے میں جس کی عمر پچاس سال سے اوپر ہو اور وہ کمانے کے لائق نہیں، اس کا کوئی قریبی رشتہ دار بھی نہیں، اس کے نام ایک رہائش کی جگہ ہے تقریباً دس مرلہ وہ بھی سرکاری زمین ہے، آیا اس شخص کو زکوۃ دینا جائز ہے؟

تنقیح: سوال میں مذکورہ جس شخص کے نام پر سرکاری مکان ہے کیا وہ اسی مکان میں رہائش پذیر ہے، یا اس کے علاوہ ان کو سرکار کی طرف سے دس مرلہ کا مکان الگ سے دیا گیا ہے، جس پر ان کی ملکیت ہے، وہ جیسے چاہے اس میں تصرف کر سکتے ہیں؟

جوابِ تنقیح: مذکورہ شخص کی رہائش ان کے رشتے کی بہن کے گھر ہے اور سرکاری جگہ جس پر ان کی ملکیت ہے وہ رہنے کے قابل نہیں، خالی پڑی ہے۔

جواب: واضح رہے کہ شرعاً مستحق زکوۃ وہ شخص ہے جس کی ملکیت میں قرضوں کو منہا کرنے کے بعد نقد رقم سونا، چاندی، مالِ تجارت اور زائد از ضرورت سامان کی مجموعی مالیت ساڑھے باون تولہ چاندی کی مالیت کے برابر نہ ہو، اور جس شخص کے پاس اتنی مالیت کا مال موجود ہو وہ مستحق زکوۃ نہیں، اور اس کو زکوۃ دینا جائز نہیں، لہذا مذکورہ شخص کی ملکیت میں جو دس مرلہ کا گھر موجود ہے، اگر وہ ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت سے زائد مالیت کا ہے تو مذکورہ شخص شرعاً نصاب کا مالک ہے، لہذا ان کو زکوۃ دینا جائز نہیں، اگر کسی نے ان کو زکوۃ دی تو اس کی زکوۃ ادا نہیں ہوگی۔

لَا يَجُوزُ دَفْعُ الزَّكَاةِ إلَى مَنْ يَمْلِكُ نِصَابًا أَيَّ مَالٍ كَانَ دَنَانِيرَ أَوْ دَرَاهِمَ أَوْ سَوَائِمَ أَوْ عُرُوضًا لِلتِّجَارَةِ أَوْ لِغَيْرِ التِّجَارَةِ فَاضِلًا عَنْ حَاجَتِهِ فِي جَمِيعِ السَّنَةِ هَكَذَا فِي الزَّاهِدِيِّ. (الفتاوى الهندية، ۱/۱۸۹)

فإن كان مستغرقا بحاجة مالكه حل له أخذها وإلا حرمت عليه ك أثياب تساوي نصابا لا يحتاج إلى كلها أو أثاث لا يحتاج إلى استعماله كله في بيته وعبد وفرس لا يحتاج إلى خدمته وركوبه ودار لا يحتاج إلى سكنها. فإن كان محتاجا إلى ما ذكرنا حاجة أصلية فهو فقير يحل دفع الزكاة إليه وتحرم المسألة عليه. (فتح القدير، ۲/۲۶۱)

نماز چھوڑنے پر کفر کا حکم لگانا

سوال: یہ حدیث مبارکہ سند اور صحت کے اعتبار سے کس درجہ کی ہے "من ترك الصلوة متعمدا فقد كفر" نیز اگر یہ حدیث مبارکہ دلیل اور حجت کی حیثیت رکھتی ہے تو پھر آج کل ہماری نجانے کتنی نمازیں چھوٹ جاتی ہیں یا رہ جاتی ہیں تو کیا ہر نماز چھوٹ جانے یا ترک ہو جانے پر ایمان اور نکاح کا اعادہ اور تجدید ضروری ہوگا؟ کیونکہ اگر کلمہ کفر جیسے زبانی فعل سے نکاح منسوخ ہوگیا تو نماز چھوٹ جانا تو عملی کفر ہوا اس لحاظ سے یہ زیادہ خطرناک ہونا چاہیے؟

جواب: سوال میں مذکورہ روایت دار قطنی کی صراحت کے مطابق موقوفاً درست ہے، اسی طرح دیگر بہت سی صحیح و مرفوع احادیث سے بھی اس روایت کے مضمون کی تائید ہوتی ہے۔ مثلاً رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ایمان اور کفر کے درمیان نماز چھوڑنے کا فرق ہے۔

آپ ﷺ نے فرمایا: إِنَّ بَيْنَ الرَّجُلِ وَبَيْنَ الشِّرْكِ وَالْكُفْرِ تَرْكُ الصَّلَاةِ. (مسلم، كتاب الايمان، باب بيان إطلاق اسم الكفر على من ترك الصلاة) ترجمہ: "انسان اور اس کے کفر و شرک کے درمیان نظر آنے والا فرق نماز چھوڑنے کا فرق ہے"۔

وعند الطبراني من حديث أنس من ترك الصلاة متعمداً فقد كفر جهاراً قال الهيثمي رجاله موثقون إلا محمد بن أبي داود الأنباري فلم أجد ترجمته وذكر ابن حبان محمد بن أبي داود البغدادي فما أدري هو أم لا اهـ وقال الحافظ الحديث سئل عنه الدارقطني فقال رواه أبو النضر عن أبي جعفر عن الربيع موصولاً ووقفه أشبه بالصواب اهـ

یہ تمام احادیث جن میں جان بوجھ کر نماز ترک کرنے پر کفر کا حکم لگایا گیا ہے ان سے مراد یہ ہے کہ اگر کوئی بدنصیب نماز کی فرضیت ہی کا منکر ہو جائے وہ کافر ہوگا۔ اور اس کی بیوی بھی نکاح سے نکل جائے گی، اس پر تجدید ایمان و نکاح فرض ہے، لیکن اگر کوئی شخص فرضیت کا منکر نہ ہو بلکہ محض سستی اور غفلت کی بناء پر نماز ترک کرتا ہو وہ جمہور علماء کے نزدیک فاسق ہے کافر نہیں۔

فذهب الجماهير من السلف والخلف منهم مالك والشافعي إلى أنه لا يكفر

بل يفسق. (تحفة الأحوذي، كتاب الإيمان، باب ما جاء في ترك الصلاة)

منت کا حکم

سوال: آپ سے پوچھنا یہ ہے کہ منت کا بذات خود کیا حکم ہے؟ اور کن حالات میں منت مانی جا سکتی ہے اور کن حالات میں نہیں مانی جا سکتی؟

جواب: نذر کا شرعی معنیٰ ہے کسی شرط پر کوئی عبادت اپنے ذمہ لے لینا، مثلاً: اگر فلاں کام ہو جائے تو میں اتنے نفل پڑھوں گا، اتنے روزے رکھوں گا، بیت اللہ کا حج کروں گا، یا اتنی رقم فقراء کو دوں گا وغیرہ، اس کو منّت بھی کہا جاتا ہے۔

شرعاً منّت ماننا جائز ہے، مگر منت ماننے کی چند شرطیں ہیں، اوّل یہ کہ منت اللہ تعالیٰ کے نام کی مانی جائے، غیر اللہ کے نام کی منّت جائز نہیں، بلکہ گناہ ہے۔ دوم یہ کہ منّت صرف عبادت کے کام کی صحیح ہے، جو کام عبادت نہیں اس کی منّت بھی صحیح نہیں، سوم یہ کہ عبادت بھی ایسی ہو کہ اس طرح کی عبادت فرض یا واجب بھی ہو، جیسے نماز، روزہ، حج، قربانی وغیرہ، ایسی عبادت کہ اس کی جنس کبھی فرض یا واجب نہیں، اس کی منّت بھی صحیح نہیں۔

اور ناجائز کام کی نذر ماننا جائز نہیں، ایسی نذر ماننے کی صورت میں اسے پورا نہ کیا جائے بلکہ اس کے بدلے میں قسم کا کفارہ ادا کر دیا جائے۔

البتہ نذر میں چونکہ عموماً اللہ تعالیٰ کی عبادت کو شرط کے ساتھ معلق کیا جاتا ہے، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نذر ماننے کو ناپسند فرمایا ہے۔ چنانچہ فرمایا کہ ”نذر مت مانو، کیونکہ یہ تقدیر کو ٹال نہیں سکتی، بلکہ یہ تو بخیل شخص سے مال نکلوانے کا ایک ذریعہ ہے۔“

یعنی نذر ماننے کی وجہ سے وہ چیز نہیں مل سکتی جس کا ملنا تقدیر میں لکھا ہی نہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے کے لیے ایسی شرط رکھنے کا کیا فائدہ؟ مؤمن کو تو ہر دم طاعت خداوندی کے لیے کمربستہ رہنا چاہیے، البتہ نذر کی وجہ سے چونکہ نیک کام واجب ہو جاتا ہے اس لیے ایسا شخص بھی صدقہ خیرات کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے، جو عام حالات میں اپنے بخل کی وجہ سے صدقہ وغیرہ نہیں دیتا۔

(النُّذور): جمع نذر، قيل: هو وعدٌ بطاعة الله على شرطٍ، يعني: إيجاب طاعةٍ على نفسه على شرطٍ، كما لو قال: إن شفى الله مريضي، فله عليّ إعتاقُ رقبة... قال رسولُ الله -صلى الله عليه وسلم-: «لا تَنْذُروا فإنَّ النَّذرَ لا يُغْني من القَدَرِ شيئًا، وإنما يُستخرَجُ به من البخيل».

قوله: «لا تنذروا، فإن النذرَ لا يُغني من القدَر شيئًا»، أراد بهذا النهي: تأكيدًا لأمر النذر، وتحذيرًا عن التهاون به بعد لزومه؛ لأنه لو لم يكن كذلك، لَمَا وجبَ على الناذرِ الوفاءُ بنذره؛ لأنه إذا كان مَنهيًّا عنه، يكون الإتيانُ به معصيةً، وتركُ المعصية واجبٌ، وكلُّ ما كان تركُه واجبًا، كيف يلزمُ الوفاءُ به؟! وإذا تقرَّر هذا فوجهُ الحديث: أنَّ النذرَ لا يردُّ القضاءَ السماويَّ، ولا يجلب لصاحبه نفعًا، ولا يدفعُ عنه ضرًّا، بل معناه: أنه لا تنذروا على ظنِّ أنكم تنتفعون بشيءٍ لم يُقدِّرْه الله سبحانه، أو تدفعون عن أنفسكم به القضاءَ الأزليَّ الذي جرى عليكم، فإذا نذرتُم فأتوا بالمنذور؛ فإنَّ الذي نذرتُموه لزم عليكم الوفاءُ به. هذا ما أورده الخطَّابي -رحمه الله- في «معالمه».

قوله: «وإنما يُستخرَجُ به من البخيل». (يُستخرَج) معناه: يخرج. الضمير في (به) يعود إلى النذر؛ يعني: يُخرَج المالُ من البخيل بواسطة النذر؛ يعني: مَن لم يكن فيه بخلٌ، فهو يعطي باختياره من غير واسطة النذر، ومَن كان فيه بخلٌ، فلا يعطي إلا إذا وجبَ عليه الإعطاءُ بالنذر. وفيه دليلٌ على وجوب الوفاء بالنذر إذا لم يكن معصيةً، فإذا امتنعَ عن الوفاء بالنذر، ألزمَه الحاكمُ بالوفاء.

فعلم أنهم أرادوا بأشتراط كونه ليس بمعصية كون المعصية باعتبار نفسه حتى لا ينفك شيء من أفراد الجنس عنها وحينئذ لا يلزم لكنه ينعقد للكفارة حيث تعذر عليه الفعل ولهذا قالوا لو أضاف النذر إلى سائر المعاصي كقوله لله على أن أقتل فلانا كان يمينا ولزمته الكفارة بالحنث فلو فعل نفس المنذور عصى وانحل النذر كالحلف بالمعصية ينعقد للكفارة

(البحر الرائق شرح كنز الدقائق ومنحة الخالق وتكملة الطوري، ٢/٣١٤)

شرکت

سوال: کوئی شخص اپنے پیسوں سے کاروبار کرتا ہے اور پھر دوسرے لوگوں کو اس میں شامل کر لیتا ہے، اور شرط یہ رکھتا ہے کہ نفع و نقصان میں سب شرکاء برابر ہیں، جس کا جتنا سرمایہ ہو گا اسی حساب سے اس کو نفع ملے گا، اور اگر نقصان ہوا، تو سب کو اپنے حصوں کے اعتبار سے نقصان بھی برداشت کرنا ہو گا، اور محنت صرف ایک شخص ہی کرے گا، جبکہ اس کے کچھ ملازم بھی ہوں گے، تو اس طرح شرکت میں حصہ لینا اسلامی شریعت میں کیسا ہے؟

جواب: اس شرط کے ساتھ شرکت کا معاملہ کرنا شرعا درست ہے کہ سب کو ملنے والا نفع کاروبار میں نفع حاصل ہونے کی صورت میں ملے گا اور اسی طرح اگر خسارہ ہو جائے تو خسارہ کو تمام شرکاء پر بقدر سرمایہ ڈالا جائے گا،، نیز شرکت کی اہم شرائط میں ایک شرط یہ بھی ضروری ہے کہ جو شخص صرف رقم سے شریک ہو عمل اس کے ذمے نہ ہو تو منافع میں اس کا حصہ سرمایہ کے تناسب سے زیادہ متعین کرنا درست نہیں۔

نیز مذکورہ شرائط کے علاوہ کچھ اہم شرائط درج ذیل ہیں:

(۱) دونوں کو ملنے والا نفع، کاروبار میں نفع حاصل ہونے کی صورت پر موقوف ہو یعنی اگر کاروبار میں نفع ہوا تو دونوں کو آپس میں مقرر کردہ تناسب سے نفع ملے گا اور اگر کوئی نفع نہ ہوا تو دونوں کو کچھ نہیں ملے گا۔

(۲) نفع متعین کرکے شراکت داری کرنا شرعا ممنوع ہے یعنی کاروبار میں رقم لگا کر نفع کو متعین کر دینا مثلا یہ کہنا کہ ہر مہینے یا اتنی مدت بعد مجھے نفع کے طور پر اتنی رقم دی جائے۔

(۳) شرکت عقد میں فریقین میں ہر ایک کو یہ حق حاصل ہے کہ عقدِ شرکت جس وقت چاہے ختم کر دے۔

نیز معاہدہ تحریری ہونا چاہیے، جس میں تمام حقوق اور ذمے داریوں کی مکمل وضاحت ہو، اور معاہدے میں کسی قسم کا کوئی ابہام نہ ہو جو کہ آگے چل کر فریقین میں باہمی نزاع اور جھگڑے کا باعث بن سکتا ہو۔ نیز بہتر ہے کہ گواہوں کی موجودگی میں نفع نقصان، ادائیگی رقم کی تاریخ اور دیگر اہم امور لکھ لیے جائیں۔ مذکورہ بالا تمام باتوں کے علاوہ ان تمام امور کا شرعی احکام کے مطابق خیال رکھنا جو عملی طور پر شرکت کے معاملات میں مختلف حالات اور مواقع پر پیش آتے ہوں۔

(قوله: وتصح مع التساوي في المال دون الربح وعكسه) وهو التفاضل في المال والتساوي في الربح وقال زفر والشافعي: لايجوز؛ لأن التفاضل فيه يؤدي إلى ربح مالم يضمن فإن المال إذا كان نصفين والربح أثلاثاً فصاحب الزيادة يستحقها بلا ضمان؛ إذ الضمان بقدر رأس المال، لأن الشركة عندهما في الربح كالشركة في الأصل، ولهذا يشترطان الخلط فصار ربح المال بمنزلة نماء الأعيان؛ فيستحق بقدر الملك في الأصل.

ولنا قوله عليه السلام: الربح على ما شرطا، والوضيعة على قدر المالين. ولم يفصل؛ ولأن الربح كما يستحق بالمال يستحق بالعمل كما في المضاربة، وقد يكون أحدهما أحذق وأهدى أو أكثر عملاً فلا يرضى بالمساواة، فمست الحاجة إلى التفاضل. قيد بالشركة في الربح؛ لأن اشتراط الربح كله لأحدهما غير صحيح؛ لأنه يخرج العقد به من الشركة، ومن المضاربة أيضاً إلى قرض باشتراطه للعامل، أو إلى بضاعة باشتراطه لرب المال، وهذا العقد يشبه المضاربة من حيث أنه يعمل في مال الشريك ويشبه الشركة اسماً وعملاً فإنهما يعملان معاً، فعملنا بشبه المضاربة وقلنا: يصح اشتراط الربح من غير ضمان وبشبه الشركة حتى لا تبطل باشتراط العمل عليهما. وقد أطلق المصنف تبعاً للهداية جواز التفاضل في الربح مع التساوي في المال، وقيده في التبيين وفتح القدير بأن يشترطا الأكثر للعامل منهما أو لأكثرهما عملا (البحر الرائق، ۱۸۸/۵)

المادة (۱۳۷۰) إذا شرط الشريكان تقسيم الربح بينهما بنسبة مقدار رأس مالهما سواء كان رأس مالهما متساويا أو متفاضلا صح، ويقسم الربح بينهما بنسبة رأس مالهما على الوجه الذي شرطاه سواء شرط عمل الاثنين أو شرط عمل واحد منهما فقط فيكون رأس مال الآخر في يده في حكم البضاعة. (مجلة الأحكام العدلية، ص: ۲۶۲)

ختم شد